ہم کیوں پیچھے رہ گئے؟

راشد شاز

مسلمان جو خیرامت کے دعویدار ہیں اور جنہیں آخری رسولؐ کے متبعین کی حیثیت سے بجا طور پر سیادت عالم کے منصب پر فائز ہونا چاہئے تھا، وہ صدیوں سے خود کو ایک چبھتے سوال کی زد میں پاتے ہیں۔ اگر واقعی وہ خیرامت ہیں اور اگر اہل ایمان کے لئے دنیا و آخرت دونوں جہان میں کامیابی کے وعدے ہیں، تو آخر ایسا کیوں ہے کہ امت مسلمہ کا گراف مسلسل روبہ زوال ہے۔ گیارہ ستمبر اور اس کے بعد کے واقعات نے اس سوال کی دھار کو اور بھی تیز کر دیا ہے۔ ایک ایسی امت جو عددی قوت میں دنیا کی ایک چوتھائی آبادی پر مشتمل ہو، جو جغرافیائی اعتبار سے اسٹرائیجک علاقوں میں سکونت پذیر ہو اور جس کی سرزمین قدرتی وسائل سے مالا مال ہو، آخر ایسا کیوں ہے کہ جدید دنیا میں اس کی حیثیت محض صارف کی ہو کر رہ گئی ہے۔ انسانی زندگی میں ٹیکنالوجی کی ترقی اور ایجادات و اختراعات سے مستقبل کی زندگی کا جو نیا نقشہ مرتب ہو رہا ہے اس میں ہمارا تخلیقی حصہ بمنزلۂ صفر کے ہے۔ مثال کے طور پر یہ خیال کہ دوسرے سیاروں پر انسانی زندگی کے امکانات سے اہل زمین کے مستقبل پر کیا اثر پڑے گا، انسانوں کے جینیٹک کوڈ کی دریافت کے بعد مستقبل میں عام فلاح کے لئے اسے کس طرح استعمال کیا جا سکے گا یا یہ کہ خلیوں کی تحقیق کے نتیجہ میں اگر بڑھاپے کو روکنا یا شباب کو طول دینا ممکن ہو سکا تو اس سے ہماری معاشرتی زندگی پر کیا اثرات پڑیں گے یا یہ کہ ایک ایسی دنیا جہاں ہر ذی روح اپنے شناختی کوڈ یا مائیکرو چپ کے سبب بین المواصلاتی نظام کا قیدی بن کر رہ جائے گی، اور یہ کہ ایک ایسی دنیا کے طلوع کو کیسے روکا جا سکتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے بارے میں کسی فیصلہ کن موقف اختیار کرنے اور اس بارے میں مناسب اقدام کرنے کا ہم مسلمان خود کو اہل نہیں پاتے۔ گویا موجودہ دنیا میں جو لوگ مستقبل کا منشور تیار کر رہے ہیں وہ یقیناً ہم نہیں ہیں۔

پھر یہ کیسا وعدہ ہے کہ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ[1] قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اہل ایمان کو غلبہ اور تفوق کی بشارت دی گئی ہے۔ اس کے برعکس وہ لوگ جنہوں نے کفر کا ارتکاب

۱۔ آل عمران ۳، ۱۳۹

کیا، جو خدا کے باغی ہوگئے ،ان کے لئے آخرت میں تو دردناک عذاب ہے ہی دنیامیں بھی ان کامقام بس یہ ہے کہ وہ صاغرون بن کر رہنے پر اکتفاکر لیں۔ اہل کفر کی دنیا وی زندگی تعذیب وتذلیل سے عبارت ہے۔دین فطرت کے خلاف بغاوت انہیں ایک ایسے مقام پر پہنچادیتی ہے کہ وہ کائنات میں جاری تخلیقی عمل سے الگ تھلگ ہو جاتے ہیں۔پالیسی امور میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔محض مادّے کی سطح پر چوپایوں کی طرح زندہ رہنا ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

کفراور ایمان در اصل دو الگ الگ رویئے ہیں۔یہ کوئی ایسی شناخت نہیں جو قوموں کو پیدائشی طور پر ودیعت ہوتی ہے۔انبیائے کرام نے جب بھی مردہ روحانی معاشرہ میں زندگی کا صور پھونکا دیکھتے دیکھتے کفاروشرکین کے معاشرہ سے اہل ایمان کی ایک بڑی تعداد سامنے آگئی۔پھر یہی لوگ جب قومی مسلمان بن گئے اور ان کی روحانی زندگی زوال پذیر ہوتی گئی تو ان ہی قوموں میں ایسے نفوس بھی پیداہوگئے جنہوں نے خدا سے بغاوت اور سرکشی کی نئی تاریخ رقم کی۔افسوس کہ اہل ایمان کے یہ طائفے جن میں بغاوت اور سرکشی کا ظہور ہوا،اس حقیقت کو نہ سمجھ پائے کہ کفر ہو یا اسلام اس کا انحصار زبانی دعویٰ پر نہیں بلکہ عمل پر ہے۔خدائے واحد کی اطاعت شعاری پر کسی مخصوص قوم یا فرد کی اجارہ داری نہیں۔قرآن مجید نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس بات کی وضاحت کی ہے کہ کس طرح یہود مدت سے اس خیال میں گم ہیں کہ وہ اب بھی اپنے تمام فکر وعمل کے زوال کے باوجود تمام اقوام عالم پر فضیلت رکھتے ہیں۔

یہود کی طرح ہم مسلمان بھی مدت سے کچھ اسی قسم کی خوش فہمی کے اسیر ہیں کہ اپنی تمام کج فکریوں کے باوجود آخری ساعت تک کے لئے دنیا کی سیادت ہمارے حصہ میں لکھ دی گئی ہے۔البتہ عملی زندگی کے تلخ حقائق ہمیں خیرامت کی مختلف تشریح وتاویل پر مجبور کرتے ہیں ۔کوئی کہتا ہے، جیسا کہ ہمارے ایک کرم فرمانے پچھلے دنوں اپنے رسالہ میں لکھا ہے کہ خیرامت تو ہم ہی ہیں اور اقوام عالم کی سیادت پر فائز بھی، ہمیں ہی فائیز کیا گیا ہے اب چاہے کوئی ہماری اقتداء کرے یا نہ کرے۔کوئی کہتا ہے کہ غلبہ سے مراد سیاسی، معاشی یا تہذیبی غلبہ نہیں بلکہ عالم روحانیت میں اعلیٰ مقام کا حصول ہے اور یہ کہ کشف ومجاہدہ کی دنیا میں ہم نے جو جھنڈے گاڑ رکھے ہیں کیا مجال کہ دوسری قومیں اس کے قریب بھی پھٹک سکیں۔ دوسری طرف اصحاب باطن ہیں جوگاہے بگاہے اس بات کی خبر دیتے رہتے ہیں کہ ابدال واوتاداور اقطاب کی مجلس میں جلدی ہی کوئی فیصلہ کن قدم اٹھایا جانے

والا ہے جس سے دنیا کی صورتحال میں حیرت انگیز تبدیلی آجائے گی۔ افسوس کہ یہ تاویلیں ہمیں صورت حال کے صحیح ادراک سے روکنے میں مسلسل کامیاب رہی ہیں۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

سچ تو یہ ہے کہ پچھلی کئی صدیوں سے، بلکہ ابوحامد الغزالی سے لے کر آج تک، مسلم ذہن مسلسل ایک مخمصہ کا شکار ہے۔ اس سلسلہ میں نئی دینیات کی تشکیل کی جو کوششیں ہوئی ہیں وہ اس سوال کی دھار کو کم کرنے کے بجائے اس میں مزید اضافہ کا سبب بنی ہیں۔ وہ لوگ جو خود کو اہل ایمان سمجھتے ہوں اور جنہیں اس بات پر مکمل یقین ہو کہ وہ خدا کے برگزیدہ بندے، خیرامت سے متصف، غلبہ وسیادت کی بشارت کے مستحق ہیں لیکن اس کے باوجود عملی زندگی میں وہ دوسروں کی اقتداء اور انحصار پر خود کو مجبور پاتے ہوں، تو یقیناً وہ اپنے آپ کو ایک بڑے روحانی مخمصہ میں مبتلا پائیں گے۔

سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ اسلام محض زبانی ایمان کا قائل نہیں۔ مسلم متکلمین کے درمیان یہ بات ابتدائی صدیوں میں ہی بحث کا موضوع بن گئی تھی کہ صرف زبانی اقرار کو استناد حاصل ہوسکتا ہے یا عملی روئیہ سے بھی اس کی شہادت لازم سمجھی جائے گی؟ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر ایمان کے ساتھ عمل صالح کا مطالبہ دراصل اسی بات پر دال ہے کہ مومنین وصادقین کا ایمان ہمیشہ عمل سے اپنی تصدیق کرتا ہے اس کے برعکس منافقین اپنے قولی ایمان کا مسلسل انکار اپنے عمل سے کرتے رہتے ہیں۔ گویا جس ایمان کی پشت پر عمل کی قوت نہ ہو اسے قابل اعتناء نہیں سمجھا جائے گا۔ ابتدائی عہد کے مسلمان جو ایمان کی اس لذت سے آشنا تھے، کائنات میں خود کو ایک کلیدی رول پر مامور پاتے تھے۔ انہیں صاف محسوس ہوتا تھا کہ آخری ساعت تک دنیا میں جو بھی کام ہوگا اب قبعین محمدؐ کی حیثیت سے اس کی قیادت کا فریضہ انہیں انجام دینا ہے۔ تب خیر کا کام یا عمل صالح کا مفہوم ان تمام کاموں پر محیط تھا جس سے نوع انسانی کی فلاح وبہبود وابستہ تھی۔ قرآن نے محمد رسول اللہ کو صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ تمام عالم انسانیت کے لئے رحمت قرار دیا تھا۔ پھر بھلا ان کے قبعین کے اعمال صالحہ سے عام دنیائے انسانیت کیوں کر متمتع نہ ہوتی؟

قرآن مجید کی مختلف آیتوں کے تقابلی مطالعہ سے یہ بات بہت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ عمل صالح دراصل نماز، روزہ، حج، زکوۃ اور وظائف جیسی شخصی عبادتوں سے بہت آگے کی چیز ہے۔ جیسا کہ

ارشاد ہے إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ [1] نماز اور زکوٰۃ سے علیحدہ عمل صالح کا یہ مطالبہ جو قرآن اہل ایمان سے کرتا ہے اور جس حوالہ سے یہ بشارت سنائی جاتی ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے ان کے رب کے پاس اجر موجود ہے، آخر ہے کیا؟ قرآن مجید نے مختلف اسالیب میں، ایسے اہل ایمان کو جو عمل صالح سے متصف ہیں، جنت کی بشارت دی ہے کہ جیسا کہ ارشاد ہے وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ [2] بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر عمل صالح کے وہ حاملین بھی جن کا تعلق دوسرے ایمانی طائفوں سے ہے مثلاً یہود و نصاریٰ اور صابئین تو ایسے خداشناسوں اور فکر آخرت رکھنے والوں کو بھی عطائے رب أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ [3] اور ہر قسم کے خوف سے نجات وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ [4] کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ گویا اہل ایمان، خواہ ان کا تعلق کسی بھی نبوی طائفہ سے ہو، اگر وہ عمل صالح کی راہ پر چل نکلیں تو دنیا و آخرت کی کامیابی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ قرآن کے اس عمومی کلیہ کی روشنی میں اگر ہم قومی مسلمان اپنا غیر جانبدارانہ محاسبہ کر سکیں تو اس سوال کا تسلی بخش جواب فراہم کرنا کچھ مشکل نہیں رہتا کہ غلبہ و استیلاء کی قرآنی بشارت سے آج ہم محروم کیوں ہیں؟

قرآن کی اصطلاح میں عمل صالح ان تمام کاموں پر محیط ہے جو خدا کے نظام کائنات سے ہم آہنگ ہو اور جس کے نتیجہ میں نوع انسانی کو عام فائدہ پہنچے۔ شاہراہ عام سے کانٹا ہٹانے اور اسے عام انسانوں کی سہولت کے لئے صاف رکھنے سے لے کر نوع انسانی کو رشد و ہدایت سے ہمکنار کرنا، انہیں توہمات و سرکشی سے نجات دلانا اور ان کے لئے خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے متمتع ہونے کے لئے یکساں مواقع فراہم کرنا، یہ سب کچھ عمل صالح کے دائرہ میں آتا ہے۔ مؤمن جہاں عمل صالح یا مثبت خلاقانہ روئیہ سے معاشرہ کی اصلاح و زیبائش میں لگا رہتا ہے وہیں کافر اپنے منفی روئیہ کی وجہ سے اس نظام عمل کو مسلسل زک پہنچانے کی فکر میں رہتا ہے۔ البتہ یہ کفار بھی اگر تائب ہو جائیں اور ایمان و عمل صالح کی راہ پر چل نکلیں تو یہ بھی کامیابی کی بشارتوں کے اتنے ہی حقدار ہوں گے۔ (قصص، ۶۷) قرآن میں بعض مقامات پر عمل صالح کو کفر کی ضد بتایا گیا ہے مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِأَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُونَ [5] جو لوگ مثبت خلاقانہ روئیہ سے متصف نہیں ہوتے، جو نوع انسانی کے قافلہ میں عمل صالح کا اپنا حصہ ڈالنے سے اجتناب کرتے ہیں اور جن کی نگاہیں اپنے ذاتی یا قومی

۱۔ بقرہ، ۲۷۷ ۲۔ بقرہ، ۸۲ ۳۔ بقرہ، ۲۷۴ ۴۔ بقرہ، ۳۰ ۵۔ روم، ۴۴

فائدہ سے آگے نہیں دیکھ پاتیں، ایسی قومیں اپنے اس منفی رویہ کی وجہ سے کفر کے بہت قریب آجاتی ہیں۔خلاّ قانہ قوتوں کا آبشار اگر خشک ہوجائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ ہم عمل صالح کی مخالف سمت میں گامزن ہیں۔ایسی قومیں دنیا کی امامت کی اہل نہیں رہتیں۔بندر صفتی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔دوسری قوموں کی نقل میں ہی وہ اپنی عافیت جانتی ہیں۔ جیسا کہ اہل یہود جیسی برگزیدہ قوم کے ساتھ ہوا كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ [1]

اس وقت دنیا میں انسانی زندگی کونئی سمت دینے،معیار زندگی کو بلند کرنے،خدا کی کائنات کی تسخیر،خشکی،سمندر اور فضاؤں میں بہتر امکانات کی تلاش،رسل ورسائل کی سہولیات،سفر وحضر کی آسائشیں اور اس جیسے جتنے اعمال صالحہ بھی انجام پارہے ہیں بدقسمتی سے قومی مسلمانوں کا حصّہ اس میں خاصہ کم ہے۔اس حقیقت سے شاید چشم پوشی مشکل ہوکہ موجودہ دور میں ہوائی سفر، ٹیلی فونی رابطے، ٹیلی ویژن،ریڈیو،کمپیوٹراور انٹرنیٹ جیسی ایجاد نے انسانی زندگی کو جس غلغلہ انگیز انقلاب سے دوچار کردیا ہے اس کے نتیجہ میں عام انسان کے لئے علوم واطلاعات سے واقفیت حاصل کرنا ماضی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ آسان ہوگیا ہے۔ Antibiotics کی ایجاد اور طب کے میدان میں جدید تحقیق نے بندگان خدا کے لئے بہتر زندگی کا سامان فراہم کردیا ہے۔ کتنے ہی بے لوث اہل فن،جن کے ناموں سے بھی ہم واقف نہیں،انہوں نے عمل صالح کی اس مہم جوئی میں اپنی زندگیاں لگادی ہیں۔ جب ہی یہ ممکن ہوا کہ آج ہم اکیسویں صدی کی ابتداء میں سائبراسپیس کے شہری کی حیثیت سے حقیقی دنیا سے بھی پرے ایک ایسی دنیا میں سانس لینے کی پوزیشن میں ہیں جو اطلاعات کے غیر مرئی تاروں کے علاوہ کہیں اور وجود نہیں رکھتی۔عمل صالح کے اس عالمی مشن میں مشرق سے افرادی قوت گاہے بگاہے ضرور ملتی رہی ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ اس عمل میں قومی مسلمانوں کی شرکت سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔البتہ گزشتہ تین سوسالوں میں اس علمی اور انکشافاتی معرکہ کی قیادت ہمارے ہاتھوں میں نہیں رہی ہے اور نہ ہی راسخ العقیدہ مذہبی فکر نے اس عمل کو عمل صالح سے تعبیر کیا ہے۔

مسلم مذہبی حلقوں میں ابوحامد غزالی کے عہد سے فکر ونظر کا جوزوال جاری رہا اس نے ہمیں یہ باور کرایا کہ کائنات میں غوروفکر اور اس کی تسخیر کا کام وقت زیاں ہے۔ہم اہل ایمان کا کام تو یہ ہے کہ ہم خود کو اور وظائف میں مشغول رکھیں کہ مجاہدہ کے بجائے مکاشفہ کا راستہ ہمیں مشاہدۂ حق کی منزل

۱۔ بقرہ، ۶۵

مقصود تک لے جاسکتا ہے۔ ہم نے دانستہ اس حقیقت کو نظر انداز کردیا کہ قرآن مجید میں کشف کے بجائے سارا زور تدبر و تعقل پر ہے۔ قرآن کے نزدیک عالم حقیقی وہی ہے جو ان آیات پر غور کرے کہ آسمان سے بارش کے چند قطرے ایک ہی زمین سے مختلف رنگوں اور اقسام کے پیڑ پودے کیسے اگاتے ہیں؟ اور اس عجیب وغریب انتظام قدرت پر اس کا دل خشیت الٰہی سے معمور ہو جائے۔ لیکن اس کے برعکس مسلم معاشروں میں عالم سے وہ لوگ مراد لئے جانے لگے جن کا نظم کائنات میں غور وفکر سے کوئی تعلق نہ تھا اور جو صرف اس حوالہ سے عالم کہے جانے لگے تھے کہ انہوں نے اپنے مدراس میں ثانوی اسکول کی ڈگریوں کو عالمیت کا نام دے رکھا تھا۔ اسی طرح عمل صالح کے حوالہ سے محیر العقول قسم کے اور وظائف مسلم معاشرہ میں رائج ہوگئے۔ کسی نے صرف تسبیح ہزار دانے پر صبح وشام تمام کرنے کو عمل صالح قرار دیا تو کسی کو یہ غلط فہمی رہی کہ الٹی کہ تیج پر سبحان اللہ وبحمدہ لکھو کھا، جوامت کی مشکل کشائی کے لئے مجرّب ہے۔ ٹیکنالوجی کی مداخلت سے ایسے دستی آلے بھی اہل ایمان کے ہاتھوں میں دیکھے گئے جو وظائف کی گنتی الیکٹرونک طریقہ سے محفوظ رکھ سکتے تھے، حلانکہ اس قسم کے بے فائدہ عمل پر حضرت عمرؓ نے ابتدائی عہد میں ہی سخت تنبیہ کی تھی، لیکن مختلف قسم کے علماء ومشائخ کے زیر اثر عمل صالح کے اس غیر قرآنی تصور نے ہماری راسخ العقیدہ فکر میں مسلسل اپنی جگہ بنائے رکھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں دوسری قوموں نے عمل صالح کے عالمی پروجیکٹ پر اپنا قائدانہ تفوق برقرار رکھا اور ان کی پیش قدمی مسلسل جاری رہی، وہیں ہم عمل صالح سے یکسر کٹ کر رہ گئے۔ مسلمانوں میں جو لوگ اس عمل میں اپنی ذاتی حیثیت سے شریک بھی ہوئے، انہیں یہ احساس ندامت مسلسل کچوکے لگاتا رہا کہ شاید اس لئے کشف ومجاہدہ اور وظائف کی دنیا کو خیر باد کہہ کر انہوں نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ وہ اپنی آخرت کے سلسلہ میں ایک طرح کے تذبذب کا شکار رہے اور شاید اس لئے کوئی بڑی کامیابی ان کے ہاتھ کم ہی آسکی!

اعمال صالحہ کے سلسلہ میں اس فکری مغالطہ نے اگر ایک طرف تعقل پسند مسلمانوں کو سیکولرزم کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کیا تو دوسری طرف مذہبی مسلمانوں کے لئے یہ مجبوری بن گئی کہ وہ ایک ایسی خیالی دنیا میں پناہ لیں جہاں تلخ حقائق ان کو پریشان نہ کرتے ہوں۔ زوال کی صدیاں دراصل اسی بات کی غمازی کرتی ہیں کہ مسلمان اہل فکر اس سوال کا براہ راست سامنا نہیں کرنا چاہتے کہ آخر اتنی بے شمار قرآنی بشارتوں کے باوجود آج ہم اہل ایمان کا حال اتنا پتلا کیوں ہے؟ حالانکہ اللہ کا صریح وعدہ ہے:

وَعَدَاللّٰهُ الَّذِيْنَ ءَ اٰمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ [1] غلبہ واستیلاء کا یہ قرآنی وعدہ اسی دنیا کے لئے بھی ہے۔اس لئے محض یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ مؤمنین عزت ووقار کے لئے ایک دوسری زندگی کا انتظار کریں۔وہ انصاف پرور خدا جو ذرہ ذرہ کے حساب کا قائل ہو، جو ہر اچھے اور برے کام پر اجر کا وعدہ کرتا ہو فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ [2] بھلا وہ اس بات کو کیسے گوارا کرسکتا ہے کہ اعمال صالحہ میں مشغول قومیں تو حاشیہ پر رہیں اور خیالی دنیا میں نیک عمل کے دعویدار اقوام عالم کی قیادت پر متمکن ہوجائیں؟

۱۔(النور ۵۵) ۲۔الزلزال، ۲